مسیحا

انیس مرزا

852، چاندنی محل، دریا گنج، دہلی۔110002

وہ بہار کی ایک اُجلی صبح تھی۔

میں نے کھڑکی کھول کر پردہ سرکایا تو سامنے دھند میں لپٹا ہوا ایک سفید مکان نظر آیا۔ جس کی کھلی چھت پر ایک پنجرے میں بند چھوٹی چھوٹی رنگین پروں والی چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور گملوں میں سفید، اُودے اور سرخ پھول کھلے ہوئے تھے اور ہری بھری ڈالیوں کے درمیان سفید اسپورٹس لباس میں ملبوس ایک نوعمر لڑکی بڑی تیزی سے ورزش کر رہی تھی۔

میرے اسپتال اور اس مکان کے درمیان صرف ایک چھوٹی سی گلی حائل تھی، یہ ایک دل کا اسپتال تھا جہاں میرے بیڈ کے ساتھ ہی پروفیسر مجیب کا بیڈ تھا اور دوسری جانب دو دیگر مریض تھے اور سب کے سب دل کے روگی تھے اور آپریشن کے انتظار میں تھے۔

پھر یہ نظارہ میرا اور پروفیسر مجیب کا معمول بن گیا۔ صبح کے ملگجے اُجالے میں لڑکی چھت پر آتی چڑیوں کو دانہ کھلاتی، کٹورے میں پانی ڈالتی، پھولوں کو عقیدت سے دیکھتی، گملوں کو پانی دیتی اور ورزش میں مصروف ہو جاتی، اسی درمیان وہ کبھی کبھی ہم دونوں بوڑھوں کو بھی دیکھ لیتی، پھر مسکرا کر سلام بھی کرنے لگی۔

وہ خاصی خوبصورت اور پُرکشش تھی، اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی دل آویزی تھی جو اپنی جانب کھینچتی تھی، کچھ دن اور گزرے تو وہ وزیر کے پاس آ کر باتیں بھی کرنے لگی، ایک دن اُس نے پروفیسر مجیب سے پوچھا— ''کیا معاملہ ہے انکل؟''

''دل کا معاملہ ہے۔ آپریشن ہونا ہے، لیکن شوگر بڑھی ہوئی ہے اس لیے میرا نمبر نہیں آ رہا۔ باقی دو مریضوں کے آپریشن ہو چکے ہیں، بس! ہم دورہ گئے ہیں—'' یہ کہہ کر پروفیسر نے میری جانب اشارہ کیا تھا۔

''یہ دل اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں انکل! انسان کو بالکل ہی کھوکھلا کر دیتے ہیں۔''

''کیونکہ دل سے ہی جسم کا سارا نظام چلتا ہے۔ دل حرکت میں رہتا ہے تو سب ٹھیک اور جہاں اس میں کوئی خرابی پیدا ہوئی یا کمی آئی تو آدمی بھی کسی کام کا نہیں رہتا ہے۔''

''ہاں! یہ دل بڑی ظالم چیز ہے انکل۔'' یہ کہہ کر اُس نے گہری، لمبی سانس لی اور اس لمحے وہ مجھے اپنی عمر سے بڑی اور سمجھدار لگی، پھر یکا یک مُڑ کر تیزی سے واپس چلی گئی۔

اس کے اس طرح چلے جانے سے پروفیسر مجیب نے حیرت سے میری طرف دیکھا، میں بھی حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی ضرور چوٹ کھائی ہوئی ہے۔

لڑکی کا نام جولی تھا اور وہ عیسائی تھی، لیکن روشن خیال، پروفیسر مجیب سے اُسے نہ جانے کیوں اتنی اُنسیت ہوگئی تھی کہ وہ ان سے گھنٹوں اور ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھی جنھیں میں بھی کافی دلچسپی سے سنا کرتا تھا، ہم دونوں کا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ وہ واقعی چوٹ کھائی ہوئی تھی اور نہایت دُکھی اور غمزدہ بھی، اس نے اپنی چاہت کی المناک داستان بے دھڑک بیان کر دی۔

''وہ ایک امیر گھرانے کا بیٹا تھا، فرشتوں کی طرح معصوم اور میں اس کی محبت میں شدت سے گرفتار تھی۔ پور پور تک ڈوبی ہوئی۔ اس سے ملتے ہی آسمان کا چاند ہماری آنکھوں میں اُتر آتا تھا اور ستارے ہماری راہوں میں بچھ جاتے تھے اور ہوائیں پھولوں کی خوشبو چرا کر آس پاس کی ساری فضاؤں میں بکھر جاتی تھیں، شاید محبت کرنے والوں کا ملاپ آسمان پر ہی ہو جایا کرتا ہے اور جب محبوب مل جاتا ہے اور اُس کی محبت حاصل ہو جاتی ہے تو اردگرد کے مناظر کی دلکشی میں خود بخود اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہر چیز نکھری نکھری اور طرحدار معلوم ہونے لگتی ہے..... کہتے کہتے وہ دفعتاً پوچھ بیٹھی۔ ''آپ کو بھی کسی سے محبت ضرور ہوئی ہوگی؟ کیوں انکل!؟''

میں نے چونک کر پروفیسر مجیب کو دیکھا جو دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔ ''بیٹی! میں ایک بوڑھا آدمی ہوں، شاید تم سوچتی ہو کہ میں جوانی کے جذبات سمجھ نہیں سکتا۔ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو ان حالات سے گزر چکا ہوں..... یہ زندگی کے اُن لمحات کی کہانی ہے۔ جب حالات

انسان کو کچل ڈالنے پر تُل جاتے ہیں، لیکن محبت کرنے والے اس منھ زور وقت کو لگام ڈال دیتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک!'' وہ سنجیدگی سے بولی۔'' میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مشکل وقت آیا تھا، لیکن اُس مشکل وقت نے میری ساری دنیا ہی بدل دی۔'' کہتے کہتے وہ رُک گئی، کچھ یاد کر کے یادوں میں کھو گئی، دیر تک خاموشی طاری رہی۔ اُس کے چہرے سے دُکھ، اُداسی اور کچھ کھو جانے کا ملال جھلکتا رہا اور کچھ پا لینے کی ملی جلی کیفیت وطمانیت بھی۔ پھر وہ تذبذب اور کشمکش کے تلاطم سے نکل آئی اور اس کی آواز ایک بار پھر گونجنے لگی۔

ایک دن میرے بوائے فرینڈ نے مجھ سے ملنے کا وعدہ لیا، وہ مجھے لمبی سیر کے لیے لے جانا چاہتا تھا اس سے پہلے کہ میں اُس کی لمبی چمکیلی کار میں بیٹھتی کہ کسی نے میرا راستہ کاٹا.... بالکل ویسے ہی جیسے کوئی بلّی راستہ کاٹتی ہے....میں ٹھٹھک گئی۔ چونک کر رُک گئی اور غصّے اور نفرت سے اُسے گھورنے لگی— پھر وہ کچھ نہ کہنے کی خواہش سے لڑتی رہی اور کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ کانپتے رہے۔

''کون تھا وہ—'' پروفیسر نے ٹوکا۔

''وہ...وہ ہماری گلی کا ایک آوارہ اور بدنام غنڈہ تھا، لیکن دلیر، نڈر اور تندرست وتوانا، بے خوفی سے کسی سے بھی بھڑ جانے والا، یہ عجیب اتفاق تھا، میں جب بھی گھر سے باہر نکلتی تھی وہ ایک بار ضرور میرا راستہ کاٹتا تھا اور اُس کی آنکھوں میں ایک پیغام ہوتا تھا جسے میں پڑھ اور سمجھ نہیں پاتی تھی، تو اُس دن بھی اُس نے ایسا ہی کیا اور ہمارا راستہ کاٹ کر مجھے گھورتا ہوا آگے نکل گیا اور میں اُسے نفرت اور حقارت سے دیکھتی رہی اور اُس وقت چونکی جب پرویز نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کار میں نہ گھسیٹ لیا اور بولا۔'' دیکھ رہی ہو، یہ بدمعاش لوگ ہیں جو قانون، اخلاق اور مذہب ومعاشرے کی قید سے آزاد ہوتے ہیں اور شہر میں یوں دندناتے پھرتے ہیں جیسے جنگل میں خوں آشام درندے....چھوڑو۔ موڈ خراب نہ کرو، سیر کا لطف کرکرا ہو جائے گا۔''

وہ سانس کھینچ کر ایک لمحے کے لیے رُکی، اُس کے بعد پھر دھیرے دھیرے بولنے لگی یوں جیسے وہ پروفیسر مجیب کو پادری سمجھ کر اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہی ہو، گزرتے وقت کی دھول اُس کی آنکھوں میں خلش پیدا کر رہی تھی اور اس کی آواز کسی ٹوٹ جانے والی ساز کی مانند ڈوبتی جا رہی تھی۔

''راستے میں رُک کر ایک شاپ سے اُس نے ٹھنڈا مشروب مجھے پلایا، اُس کے بعد ایک لمبی ڈرائیو کے بعد وہ ایک سنسان مقام پر واقع ایک ویران سے بنگلہ میں لے گیا، جہاں پرویز کے چار اور دوست پہلے سے موجود تھے، ٹیپ ریکارڈر چل رہا تھا جس کی موسیقی کی دھن پر وہ تھرک رہے تھے اور ہاؤ ہلّا مچا رہے تھے، مجھے وہ نشے میں بھی لگے، کیونکہ اُن کے قدم اور زبانیں لڑکھڑا رہی تھیں، میں نے چونک کر پرویز کی طرف دیکھا تو وہ ہنس کر بولا یہ سب میرے جگری دوست ہیں، آج چھٹی ہے اس کا لطف اُٹھا رہے ہیں اور میں تمھیں اُن کی خوشیوں میں شامل کرنے لایا ہوں....''

یہ کہتے کہتے اُس نے جھرجھری سی لی....''لیکن بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ مجھے فریب دے کر یہاں لایا گیا ہے۔ پرویز اپنے علاوہ اپنے دوستوں کو بھی میرے جسم سے کھیلنے کی سازش رچ کر آیا تھا۔ میں نے....میں نے سخت احتجاج کیا....آپے سے باہر ہو گئی اور اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے اُن سے بھڑ گئی، میں اکیلی اور وہ پانچ شیطان...مزاحمت میں میرے کپڑے تار تار ہو گئے اور پھر اس سے پہلے کہ میری عصمت بھی تار تار ہوتی ایک زبردست دھماکے کے ساتھ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور کھڑکی مع چوکھٹ کے کسی انسانی وجود کے ساتھ کمرے میں آ گری.....

وہ بولتے بولتے رُک گئی۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا اور مجھے یہ سناٹا بہت ہی خوفناک اور اعصاب شکن معلوم ہونے لگا۔

''یہ وہی غنڈہ تھا جو کھڑکی سمیت میری عصمت بچانے کے لیے کسی فرشتے کی طرح کمرے میں آ گرا۔ تھا اُس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چمکدار چاقو تھا، آتے ہی وہ ان پانچوں سے بھڑ گیا، اُن میں سے چار تو اُس کے وحشیانہ حملہ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے، مگر ایک اس کے چاقو کی بھینٹ چڑھ گیا....'' اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔'' کمرے میں مرگ آسا سکوت چھایا ہوا تھا اور جس کی دیواروں پر میری آرزوؤں اور ان گنت خواہشوں کا لہو چمک رہا تھا، ان آرزؤں کا لہو جو حسرت بن گئی تھیں اور ہر گزرتے ہوئے زندہ لمحے کو قتل کر کے اُس کی لحد بنانے میں مصروف تھیں اور اُس لمحے میں نے خود کو پا لیا، پھر سے دریافت کر لیا....اور یہ آخری لمحے کی روشنی تھی جس نے مجھے تاریکیوں کے گرداب سے نکال کر چمکیلے اُجالوں میں پہنچا دیا اور پھر....اس کے بعد اپنے آپ سے ایک عہد کر لیا جس پر آج تک قائم ہوں۔''

میں نے اور پروفیسر مجیب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔'' وہ جیل چلا گیا اور میں نے عہد کر لیا کہ اگر وہ واپس آیا تو اُس سے ہی شادی کروں گی۔ اگر نہیں آیا تو زندگی بھر کنواری رہوں گی اور میرے اس عہد اور اعتماد کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ پچھتاوے کے تیز نکیلے تیر اس کے وجود کی فصیل میں جیسے ترازو ہو گئے تھے اور جسے ماضی اور اپنے آپ سے ندامت سی محسوس ہو رہی تھی اور ایک کربناک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر سجی ہوئی تھی، پھر وہ پلٹی اور بھاگ کر چلی گئی۔

میں اور پروفیسر مجیب خاموشی کے طلسم کے اسیر بن گئے.... کیونکہ ہم جانتے تھے عورت کی محبت یا نفرت کے سامنے کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی عشق عورت کو بھی سرفروش بنا دیتا ہے۔

پھر اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی واقعات پیش آئے، اسی دن میرا آپریشن ہوا اور دوسرے پروفیسر مجیب کو تیار رہنے کے لیے کہہ دیا گیا، کیونکہ اُن کی تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اُن کا آپریشن بہت ضروری ہو گیا تھا۔

ہم دونوں کی حالت اُس رات بے حد خراب رہی اور ہم نے بے چینی سے یہ رات گزاری اوپر سے ایک حادثہ ہماری پریشانی کا باعث بن گیا، اسپتال کے باہر ایک زبردست دھماکہ ہوا جس سے پورے علاقہ کی بجلی چلی گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا اور ایک دہشت کا ماحول پیدا ہو گیا۔ پورا علاقہ پولیس چھاؤنی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اب اندھیرا ہر سمت تھا اور رات یوں گزر رہی تھی جیسے نزع کے کرب میں مبتلا شخص کی رات گزرتی ہے۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ رات کٹی اور صبح کا ملگجا اُجالا نمودار، ایسی ملگجی، اُداس اور بے کیف صبح میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

پھر حسب معمول ہم نے جولی کو ٹیرس پر آتے دیکھا، اُس نے چڑیوں کو دانہ پانی دیا، اُن سے باتیں کیں، پھولوں کے گملوں میں پانی بھرا اور اُس کے بعد ورزش میں مصروف ہو گئی... لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس طرح کانپی جس طرح طوفان کی زد پر آیا ہوا پتّا کانپتا ہے، اُس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا اور گہری، بہت گہری سانسیں لیتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کی اور ناکام رہی، لڑکھڑائی اور کٹے ہوئے شہتیر کی مانند زمیں بوس ہو گئی؟

میں اور پروفیسر مجیب دونوں چونک گئے؟ یقیناً جولی کو دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی، اُسے فوری مدد کی ضرورت تھی، مگر مشکل یہ تھی کہ ہم بٹن دبا کر اسپتال کے عملہ کو بُلا نہیں سکتے تھے، کیونکہ بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ہم نیچے جا نہیں سکتے تھے، کیونکہ میرا آپریشن ہوا تھا اور بالکل ہلنے جلنے کی ممانعت تھی۔ پروفیسر مجیب کو ڈاکٹروں نے نقل و حرکت سے بالکل منع کر رکھا تھا، اس کے باوجود وہ بستر سے اُتر کر لفٹ کی طرف لپکے، لیکن بجلی ہوتی تو لفٹ چلتی وہ پلٹ کر تیزی سے زینے کی طرف گئے اور دھیرے دھیرے ایک ایک زینہ اُتر کر کراہتے ہوئے اور گہری گہری سانسیں لیتے وہ میری نظروں سے غائب ہو گئے۔

آخر کچھ دیر بعد میں نے ٹیرس پر اسپتال کے عملہ کو دیکھا جو جولی کو اسٹریچر پر اُٹھا کر لے جا رہے تھے۔ پروفیسر مجیب کی کوشش کامیاب رہی تھی اور جولی کو بروقت طبّی امداد مل گئی تھی۔

پروفیسر مجیب جس طرح گرتے پڑتے سیڑھیوں سے نیچے گئے تھے اسی طرح ایک ایک زینہ طے کر کے ہانپتے کانپتے اوپر چوتھی منزل پر پہنچے اور بستر پر آ کر ڈھیر ہو گئے، اُن کی حالت بھی چڑھنے چھڑنے میں کافی بگڑ چکی تھی اس لیے انھیں بھی فوری طور پر نیچے آپریشن روم میں لے جایا گیا، اب جولی اور پروفیسر مجیب دونوں آپریشن روم میں ڈاکٹروں کی نگرانی میں تھے اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ آج کے بعد پھر کوئی ایسی رات آئے گی جب اپنی تنہائی کے سوا میرا کوئی رفیق نہ ہوگا؟

رہ رہ کر مجھے پروفیسر اور جولی کا خیال آ رہا تھا، پروفیسر مجیب جو اپنی جان کی پروا نہ کر کے سخت تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود چار منزلہ سیڑھیاں اُتر اور چڑھ کر جولی کی جان بچانے گئے تھے اور جولی جو ایک آوارہ مسیحا کی ذات کے صحرا میں آبلہ پائی کا عزم کر چکی تھی اور اپنی ساری کشتیاں جلا کر واپسی کے تمام راستے بند کر چکی تھی اور اب مستقبل کے اُفق پر اُٹھنے والی تاریک گھٹائیں میری نظروں سے اوجھل تھیں، میرے سامنے صرف حال تھا اور میری کائنات سمٹ کر اُس آپریشن روم میں چلی گئی تھی جہاں پروفیسر مجیب اور جولی زندگی کی جدوجہد سے نبرد آزما تھے۔

پھر وہم ایک خوف بن کر میرے ذہن پر مسلط ہو گیا۔

زندگی کی راہیں کتنی انجانی اور پر ہول ہوتی ہیں۔ مجھے پروفیسر مجیب کی باتیں یاد آ رہی تھیں جو کہتے تھے۔ زندگی سب سے قیمتی شے ہے، جس کے تحفظ کے لیے انسان تمام حدیں پھلانگ سکتا ہے، دیکھو نا، ایک سیدھا سادا اصول یہ ہے کہ کچھ نہ کرو اور اگر کرو تو جان پر کھیل جاؤ، وہ حوصلہ دیتے تھے، جینے کا، زندہ رہنے کا اور اب.... خود اس زندگی سے جنگ میں مصروف تھے۔

آخر وہ منحوس خبر آ گئی— ڈاکٹروں نے جولی کو تو بچا لیا تھا، مگر پروفیسر مجیب کو نہیں بچا سکے تھے، پروفیسر جان پر کھیل گئے تھے۔

صحت یاب ہونے کے بعد میں پروفیسر مجیب کی قبر پر گیا تو دیکھا وہاں تازہ پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا ہے، میں سمجھ گیا یہ گلدستہ جولی اپنے مسیحا کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے روزانہ رکھتی ہوگی۔

پھر اتفاقاً ایک شام جولی سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں اس نے کہا— میرے دو مسیحا ہیں ایک عزت بچانے والا آوارہ مسیحا اور ایک زندگی بچانے والا عظیم مسیحا جس کی روح کے سکون کے لیے وہ روزانہ اُن کی قبر پر صبح پھولوں کا گلدستہ رکھنے جاتی ہے اور شام کو موم بتیاں جلاتی ہے اور اس کے ساتھ اپنے آوارہ مسیحا کا انتظار کرتی ہے۔ ◆◆◆